pklibrary.net
لہو کے پھول
محی الدین نواب
pklibrary.net

www.pklibrary.net

لہو کے پھول

اردو زبان میں اسلوب، انداز اور اسٹائل کیا
ہوتا ہے؟

اردو الفاظ میں جذبے کتنی خوبصورتی سے بولتے ہیں؟

زبان ہمیں کسی ماحول کی سچی عکاسی کیسے سکھاتی ہے؟

قلم کا ہنر کیا ہو کہ کردار سچ مچ جاگنے لگیں؟

جو لوگ کہتے ہیں کہ اردو میں زبان کے اعتبار سے
قابلِ ذکر کہانی نہیں لکھی گئی، وہ "لہو کے پھول" پڑھیں۔
محی الدین نواب نے اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے کا حق
ادا کر دیا ہے۔

(لہو کے پھول — کارسٹل وولریچ کی کہانی دی موت
ایٹ ہوشاں وماسے ماخوذ ہے)

www.pklibrary.net

لہو کے پھول

گدھا گاڑی بہت ہی پرانی اور بوڑھی تھی۔ اس میں بیٹھی ہوئی لڑکی نہایت ہی حسین اور جوان تھی۔ گاڑی کچے راستے کے نشیب و فراز میں ہچکولے کھاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ گاڑی بان کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی ہر ہچکولے پر ڈگمگا رہی تھی اور چاروں طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار اس علاقے سے گزر رہی ہو۔

دور دور تک سندھ کی بنجر زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کھیت نظر آ رہے تھے اور جہاں کھیت نظر آتے تھے وہاں لڑکی کی آنکھوں میں پیار بھری خوشیوں کی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا' وہ ان کھیتوں کی جوان فصلوں میں اپنے گبرو جوان کا چہرہ دیکھ رہی ہو۔

اس کی سیاہ غزالی آنکھیں' ریشم جیسے سنہری بال' اس کے چہرے کی دودھیا رنگت اور اس کا پہناوا دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پنجاب کے کسی علاقے سے آئی ہے اور سندھ کی تپتی ہوئی دھوپ میں پسینہ پسینہ ہوتی جا رہی ہے۔ دھوپ کی تپش میں اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ راستے کی اڑتی ہوئی گرد اس کے حسن کو دھندلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ گاڑی جھٹکے کھاتی ہوئی' کبھی اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر

www.pklibrary.net

اچھلتی ہوئی دھمکیاں دے رہی تھی کہ اسے اٹھا کر راستے کے کنارے پھینک دے گی لیکن وہ بڑے ہی اعتماد سے ایسے بیٹھی ہوئی تھی جیسے ایک عورت اپنی آنکھوں میں انتظار سجا کر اور ایک ماں اپنی گود میں بچے کو سنبھال کر بیٹھتی ہے۔ اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔

بچہ اس کے ہاتھوں کے پالنے میں تھا اور اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال بھی سنہرے تھے۔ جسم کی رنگت سرخ و سفید تھی۔ اسے اس دنیا میں آئے ہوئے زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس دن ہوئے تھے۔ لڑکی اس انتظار میں تھی کہ بچہ گود میں آئے گا تو اس سفر کا آغاز کرے گی۔ اس کے گھر والوں نے اسے روکا تھا کہ ایسی حالت میں اسے گھر سے نکلنا نہیں چاہیے لیکن وہ سب کے روکنے ٹوکنے کے باوجود بچے کے باپ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تھی۔

نہ جانے وہ کون بد نصیب تھا جو ایسے بے پناہ حسن و شباب کو بھول کر کہیں بھٹک گیا تھا۔ وہ حسینہ ایسی تھی جسے کوئی بھی شخص اپنی نگاہوں کے فریم میں ہر وقت سجائے رکھتا۔ اس وقت وہ نارنجی رنگ کے سوٹ میں سرخ گلاب کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ اس کے محبوب کو سرخ گلاب پسند تھے' وہ اکثر سوچتا تھا کہ جب اس کا ایک مکان ہوگا تو اس کے آنگن میں سرخ گلاب کے پودے لگائے گا لیکن جب وہ دلہن بن کر آئی تو اس نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا۔

"شادو! اس سرخ جوڑے میں گلاب کی کلی نظر آتی ہو۔ کبھی کبھی یہ لباس پہن لیا کرنا' اب میں گلاب کے پودے نہیں لگاؤں گا........"

شادو سہاگ رات کے ان رنگین اور معطر لمحات کو یاد کر کے سندھ کی جلتی ہوئی دھوپ میں بھی مسکرانے لگی۔ عورت کہیں بھی ہو' اگر اس کی آنکھوں میں اپنے گبرو جوان کی تصویر ہو تو وہ انگاروں پر بھی چلتے ہوئے مسکرانی ہے۔

دور ایک بڑا سا مکان نظر آ رہا تھا۔ مٹی کی چھت اور مٹی کی دیواریں تھیں۔ ایک درخت کے سائے میں دو بھینسیں بیٹھی ہوئی جگالی کر رہی تھیں۔ شاید اس کی منزل آگئی تھی۔ اس کا انتظار ختم ہو رہا تھا۔

گدھا گاڑی دروازے کے قریب آ کر رک گئی۔ گاڑی بان نے کھردرے لہجے میں

www.pklibrary.net

کہا۔ "یہ عثمان گوٹھ ہے۔ آگے دو فرلانگ پر ایک چھوٹی سی بستی ہے' اب بتاؤ اسی مکان میں جانا ہے یا آگے بستی میں؟"

"میرے خیال میں یہی مکان ہے۔" شادو نے کہا۔ "میں اسی مکان کے پتے پر خط لکھتی رہی ہوں۔ تم ذرا ٹھہرو' میں دروازے پر دستک دے کر پوچھتی ہوں۔"

گاڑی بان نے بے رخی سے کہا۔ "بی بی جی! میرا کرایہ دو۔ میں یہاں سے جاؤں گا۔ تم دس گھروں میں پوچھتی پھرو گی تو میں تمہارے پیچھے نہیں پھروں گا۔ وہ تو اسٹیشن ماسٹر کی زبردستی سے میں بیس میل دور آگیا ہوں۔ اچھا ظلم ہے۔ بابو لوگ رعب جما کر ہمیں بھی گدھوں کی طرح ہانک دیتے ہیں۔ اونہہ! لاؤ میرا کرایہ۔ پورے چھ روپے لوں گا۔"

وہ چپ چاپ گاڑی سے اترنے لگی۔ گاڑی بان نے کپڑوں کی گٹھری اور پلاسٹک کا تھیلا اٹھا کر دروازے پر رکھ دیا' پھر اس سے چھ روپے وصول کر کے گاڑی کو موڑتا اور زیر لب بڑبڑاتا ہوا واپس جانے لگا۔

وہ انجانی جگہ پر تنہا رہ گئی۔ دروازے پر سامان رکھا تھا گود میں بچہ سو رہا تھا اور سر پر سورج چمک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دینے لگی۔

دستک کے جواب میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر دروازہ ذرا سا کھلا۔ اتنا سا کہ اندر سے صرف ایک بڑھیا کا چہرہ جھانکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ بکھرے ہوئے بالوں کے درمیان سیاہی مائل جھریوں دار چہرہ' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی' ناک طوطے کی طرح نوکیلی' سامنے کے دو دانت قدرے لانبے تھے اور نچلے ہونٹ پر دھنسے ہوئے لگتے تھے۔ وہ ایسا خبیث چہرہ تھا کہ شادو اسے دیکھتے ہی کسی انجانے خطرے کے احساس سے کانپ گئی۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے پوچھا۔

"یہ...... فریدے کا مکان ہے؟"

"فریدے؟" بڑھیا نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "تم کون ہو؟"

"میرا نام شاداں ہے۔ میں جڑاں والا سے آئی ہوں۔ فریدے یعنی کہ فرید میرا خاوند ہے۔"

بڑھیا کی نظریں اور زیادہ چبھنے لگیں۔ مکان کے اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "ماں جی! کون ہے؟"

www.pklibrary.net

بڑھیا نے جواب دیا۔ "ایک جوان لڑکی ہے۔ گود میں بچہ ہے۔ کہتی ہے کہ فریدے اس کا خاوند ہے۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی ایک عورت وہاں پہنچ گئی اور دروازے کو پوری طرح کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ آنے والی عورت شادو کی ہم عمر تھی۔ اس کی طرح جوان اور صحت مند تھی لیکن اس کے جیسا اجلا رنگ نہیں تھا۔ وہ گہرے سانولے رنگ کی دوشیزہ تھی۔ وہ شادو کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی مصیبت دروازے پر آگئی ہو۔ وہ روکھے پن سے بولی۔ "یہاں کوئی فرید احمد نہیں رہتا ہے آگے بستی میں جا کر پوچھو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شادو نے کہا "میں فرید احمد عثمان گوٹھ معرفت محکمہ زراعت سندھ کے پتے پر خط لکھتی رہی ہوں۔ سات ماہ پہلے فریدے نے میرے ایک خط کا جواب دیا تھا۔ بہن! تم ہی میری یہ الجھن دور کرو کہ یہاں سے کس فریدے نے مجھے خط لکھا تھا؟"

اس سانولی لڑکی نے کہا۔ "تم خود ہی ہمیں الجھا رہی ہو۔ ہم پہلی بار کسی فرید کا نام سن رہے ہیں۔ تم محکمے والوں کے پاس جا کر پوچھو تو تمہیں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔"

"میں کہاں جاؤں؟ کس سے پوچھوں؟ اس علاقے میں پہلی بار آئی ہوں۔ سفر کی تھکن سے برا حال ہو رہا ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے۔ کیا تم مجھے تھوڑی دیر ستانے کی اجازت نہیں دوگی؟ تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم بھی پنجاب کی رہنے والی ہو۔ میں بھی تمہاری علاقے کی ہوں۔ میری پریشانیوں کا خیال کرو۔"

سانولی لڑکی نے اپنی بوڑھی ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ خبیث بڑھیا نے شادو سے کہا۔ "یہ میری بیٹی کندن بی بی ہے۔ صبح اس کا بچہ مر گیا ہے۔ گھر میں اس کی میت پڑی ہے۔ تمہاری گود کا بچہ کیا زندہ ہے۔ کیا اس بچے کو تم ہمارے گھر میں لے کر آؤ گی؟"

"ماں جی!" شادو نے کہا۔ "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میرے بچے کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"ہی ہی ہی!" بڑھیا کے دو لانبے دانت کچھ اور نمایاں ہو گئے۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "بے شک زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن موت انسان کے ہاتھ میں ہے۔ ایک انسان بڑی آسانی سے دوسرے انسان کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔"

www.pklibrary.net

شادو کو ایسا لگا جیسے وہ بڑھیا دھمکی دے رہی ہے۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو شادو اس خبیث بڑھیا اور بد مزاج کندن بی بی کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتی مگر اس وقت آس پاس کوئی دوسرا مکان نہ تھا۔ قریبی بستی وہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ گدھا گاڑی میں بیس میل کا سفر کرنے کے بعد بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ تھکن، شوہر کی گمشدگی، مایوسی اور تنہائی نے ایسا نڈھال کر دیا تھا کہ وہ وہاں بیٹھ کر تھکن اتارنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کندن نے کہا۔

"یہ علاقہ بہت خطرناک ہے۔ چور بدمعاش تنہا عورت کو پا کر اس کی بے عزتی کرتے ہیں پھر اسے قتل کر دیتے ہیں۔ تعجب ہے تم یہاں تک تنہا کیسے آ گئی ہو؟"

"محبت کھینچ لائی ہے۔" شادو نے مسکرا کر کہا۔ "جب تک فرید کا پیار زندہ ہے۔ مجھے کوئی قتل نہیں کر سکے گا۔ کیا میں اندر آ جاؤں؟"

"آ جاؤ۔" دونوں ماں بیٹی ایک طرف کو ہو گئیں۔

شادو ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھال کر اور دوسرے ہاتھ سے سامان اٹھا کر ان کے سامنے سے گزری تو کندن مرجھا گئی۔ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن شادو کے چکنے اور اجلے بدن کے مقابل وہ سیاہ پڑ گئی تھی اور بڑی حاسدانہ نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ بڑھیا نے کہا۔

"تم بہت دور سے آ رہی ہو۔ میں تمہارے لیے نمکین لسی لے کر آتی ہوں۔"

"نہیں ماں جی! بچہ میرا دودھ پیتا ہے۔ میں لسی پیوں گی تو اسے زکام ہو جائے گا۔ آپ مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیجیے۔"

بڑھیا کمرے سے باہر چلی گئی۔ شادو نے منجھی پر بیٹھ کر بچے پر سے چادر ہٹا دی اور اپنے دوپٹے کے آنچل سے اسے پنکھا جھلنے لگی۔ بچے نے آنکھیں کھول دیں تھیں۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں کندن کے دل میں چبھنے لگیں۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ماں چاند تھی، بیٹا چاند کا ٹکڑا تھا۔ شادو نے اسے چوم کر کہا۔

"بالکل اپنے باپ جیسا ہے۔ فرید کی آنکھیں بھی نیلی ہیں۔"

کندن نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "کہاں ہے تمہارا فرید؟"

وہ طنز نہ کرتی، سادگی سے پوچھتی، تب بھی یہ دل دکھانے والی بات تھی کہ فرید اس

www.pklibrary.net

کی محبت کا مذاق اڑانے کے لیے اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ اسے تلاش کرنے جڑانوالہ سے بس میں بیٹھ کر شور کوٹ آئی۔ وہاں سے ٹرین کے ذریعے شہداد پور اور وہاں سے گدھا گاڑی میں بیٹھ کر اس اجاڑ علاقے میں پہنچی جہاں دو بھینسوں اور دو عورتوں کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ کندن کے سوال کا جواب دینے کے بجائے دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ دوسری طرف کے کھلے ہوئے دروازے سے گھر کا آنگن نظر آ رہا تھا۔ آنگن کے وسط میں ایک کنواں تھا اور کنویں کے اس پار.......

اس پار نظر پڑتے ہی شادو کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھیں ایک نئی امید سے روشن ہو گئیں۔ کنویں کے اس پار گلاب کے پودے نظر آ رہے تھے۔

گلاب' جو فرید کو پسند تھے۔ اور وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کا اپنا گھر ہو گا تو آنگن میں سرخ گلاب کے پودے لگائے گا۔ مگر وہاں جو گلاب کھلے ہوئے تھے' وہ سفید تھے اور عورتیں کہہ رہی تھیں کہ یہ فرید احمد کا مکان نہیں ہے پھر وہ کون شوقین ہے جو بنجر زمین پر گلاب کے پھول کھلا رہا ہے؟

اب شادو کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کسی دوسرے کا مکان ہے۔ دل کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے فرید کے مکان میں بیٹھی ہے اور اس کے آنگن میں گلاب کھل رہے ہیں۔ بلا سے وہ سرخ نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کی مٹی میں سرخ گلاب نہ کھلتے ہوں۔ فرید نے سفید پر ہی اکتفا کی ہو۔ بہرحال دل میں امید کی ایک کرن پھوٹ رہی تھی۔

اس نے کندن سے پوچھا۔ "تمہیں گلاب کے پھول پسند ہیں؟"

"میرے آدمی کو پسند ہیں۔ وہ سرخ......" وہ کہتے کہتے ٹھٹک گئی اور ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر شادو کے نارنجی رنگ کے لباس کو گھورنے لگی۔ وہ لباس کی پنکھڑیوں میں لپٹی ہوئی سرخ گلاب کی ایک کلی نظر آ رہی تھی۔ اس لیے کندن یہ نہ کہہ سکی کہ اس کے مرد کو کس رنگ کا گلاب پسند ہے۔

شادو اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کہتے کہتے کیوں رک گئی ہے لیکن اسی وقت بڑھیا ایک گلاس میں پانی لے کر آ گئی۔ اس نے گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔
"تمہارے خاوند کا کیا نام ہے؟"

www.pklibrary.net

اس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے افق سے دیکھا' دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اس کا نام کرم دین ہے۔" کندن نے مختصر سا جواب دیا اور جلدی سے اپنی ماں کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئی۔ آنگن میں پہنچ کر اس نے کن انکھیوں سے شادو کی جانب دیکھا۔ پھر وہاں سے بھی ماں کو کھینچتے ہوئے دوسری طرف چلی گئی اور شادو کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

شادو اس طرح منجھی پر بیٹھی ہوئی تھی کہ دونوں ماں بیٹی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں لیکن ان کا سایہ آنگن کے کچے فرش پر نظر آ رہا تھا۔ دو سائے آپس میں سر جوڑ کر کچھ کہہ رہے تھے' کچھ سن رہے تھے۔ کبھی ان کے سر اثبات میں اور کبھی نفی میں ہلتے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ نچا کر باتیں کرنے کی عادی تھیں اس لیے ان سایوں کے ہاتھ بار بار ناچ رہے تھے۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے ڈھلتی ہوئی دوپہر میں دو چڑیلیں آنگن کے کچے فرش پر تھرک رہی ہیں۔

ان کی حرکتوں سے شادو کو یقین ہو رہا تھا کہ وہ ماں بیٹی اس سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ جو کہنا چاہیے وہ نہیں کہہ رہی ہیں شادو بڑی حد تک کچھ کچھ سمجھ رہی تھی اور جیسے جیسے وہ سمجھ رہی تھی' اس کا دل رو رہا تھا۔ رونے کی بات ہی تھی۔ سرخ گلاب فرید کو پسند تھے اور کندن کے خاوند کی پسند بھی وہی تھی۔ کندن نے جس انداز میں سوچ کر اپنے خاوند کا نام بتایا تھا اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کا نام کرم دین نہیں ہے' اس کے خاوند کا نام.......

"نہیں۔ نہیں۔" وہ اپنے دل کو سمجھانے لگی۔ "کندن کے خاوند کا نام فرید احمد نہیں ہو سکتا۔ فرید میرا ہے۔ مجھے دل و جان سے چاہنے والا کندن کا خاوند نہیں بن سکتا......."

وہ سوچ میں گم تھی کہ بچے کے رونے سے چونک گئی۔ اتنے میں دونوں ماں بیٹی بھی کمرے میں واپس آ گئیں۔ کندن نے کہا۔

"میں ماں جی کو سمجھا رہی تھی کہ تم بہت دور سے آئی ہو۔ اس علاقے میں تنہا اپنے خاوند کو تلاش نہیں کر سکو گی۔ میرا آدمی تمہارے فرید کو آسانی سے ڈھونڈ نکالے گا۔"

www.pklibrary.net

"تمہارا آدمی کہاں ہے؟" شادو نے پوچھا۔

"وہ محکمہ زراعت کے ایک افسر سے ملنے سکھر بیراج گیا ہے، رات کو کسی وقت لوٹے گا یا صبح تک ضرور آجائے گا۔ اس کے آنے تک تم یہاں رک جاؤ۔ اس کے انتظار میں میں نے اپنے بچے کو اب تک دفن نہیں کیا ہے۔

شادو نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ اس گھر میں ایک بچے کی میت رکھی ہوئی ہے۔ اچانک شادو کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ اس کے سامنے ایک ماں اپنے بچے سے محروم ہوگئی تھی۔ ایسی حالت میں کندن بیزاری سے اور اکھڑے ہوئے لہجے میں باتیں کر رہی تھی اور شادو اسے بدمزاج سمجھ رہی تھی۔

اگر وہ بدمزاج ہوتی تو اسے اپنے گھر میں رہنے کے لیے نہ کہتی اور اس کے فرید کو تلاش کرنے کے لیے اپنے خاوند کی خدمات پیش نہ کرتی۔ اس نے ہمدردی سے کہا۔

مجھے تمہارے بچے کی موت کا سخت افسوس ہے۔ کیا وہ بیمار تھا؟"

"نہیں بیمار نہیں تھا۔ بس سات دنوں کی زندگی لے کر آیا تھا۔ اسے دیکھو گی؟"

"ہاں دیکھوں گی۔ یہ رو رہا ہے، پہلے اسے دودھ پلا کر سلا دوں، پھر دیکھتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے قمیض کا دامن اٹھانے لگی۔

ایک ماں اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ لہٰذا وہاں خیالات کی پاکیزگی ہونی چاہیے تھی اور ایسے وقت جب کہ اس کو دیکھنے والی عورتیں ہی تھیں۔ کسی عیاش مرد کی نگاہیں نہیں تھیں لیکن بعض اوقات ایک حاسد عورت دوسری عورت سے اپنا موازنہ کرنے کے لیے بہت دور تک دیکھتی ہے اور بہت دور تک سوچتی بھی ہے۔ کندن بھی اس وقت بہت گہرائی میں سوچ رہی تھی۔ اپنے بارے میں، شادو کے بارے میں اور فرید کے بارے میں کہ وہ دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں تھیں۔

کندن دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ عورت کبھی برداشت نہیں کرتی کہ اس کا آدمی کسی دوسری دنیا...... میں بھٹک جائے۔

وہ زیادہ دیر تک اس حسین نظارے کو برداشت نہ کر سکی۔ اور منہ پھیر کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ بڑھیا پہلے ہی گلاس لے کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی تھی۔ جب بچہ سو گیا تو شادو نے اسے منجھی پر ڈال دیا۔ پھر اس کے نصف جسم کو چادر سے ڈھانپ کر

www.pklibrary.net

اسے ممتا بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسی دوران اسے مردہ بچے کا خیال آیا تو پھر کندن کے لیے اس کا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔

آنگن میں پہنچ کر اس نے گلاب کے پھولوں کو دیکھا تو پھر فرید کا چہرہ مسکرانے لگا۔ اس کی سوچ رہ رہ کر بدل رہی تھی۔ کبھی وہ یہ سوچتی کہ وہ فرید کے لگائے ہوئے پودے ہیں اور کبھی کندن کی اجڑی ہوئی ممتا متاثر کرتی کہ ایک غمزدہ عورت جھوٹ نہیں بول سکتی۔ یہ کسی کرم دین کا مکان ہے۔

اس نے بیچ آنگن میں کنویں کے پاس کھڑے ہو کر دیکھا۔ دونوں ماں بیٹی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ شاید بڑھیا باورچی خانے میں تھی اور کندن اس سامنے والے کمرے میں تھی۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شادو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے پر آ گئی۔ کمرے کے اندر وہ نہیں تھی۔ اس کا مردہ بچہ ایک چٹائی پر پڑا ہوا تھا۔

اس نے جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔ دو چار قدم آگے بڑھی پھر بچے کا چہرہ واضح طور پر نظر آیا تو وہ ٹھٹک گئی۔ وہ مر چکا تھا مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ جیسے فرید کی آنکھیں نیلی تھیں!!

وہ مرجھا گئی اور اس کا دل لرزنے لگا کندن کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے نے فرید کی آنکھیں کیسے چرا لیں؟

کیا کرم دین کی آنکھیں نیلی ہیں؟

یہ کیسے ممکن ہے کہ فرید اور کرم دین کی پسند بھی ایک...... سرخ گلاب۔

دونوں کی آنکھیں بھی ایک جیسی...... نیلی!

وہ بچے کو یک ٹک دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آج کی رات وہ ضرور اس گھر میں گزارے گی اور اس کرم دین کو دیکھے گی جو رات کے وقت یا صبح تک یہاں پہنچنے والا ہے۔

دروازے پر آہٹ سنائی دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کندن کھڑی اپنے مردہ بچے کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

"یہ میرا بچہ ہے۔ آج سے چھ دن پہلے جب یہ پیدا ہوا تھا تو قریب کی بستی سے ہماری جان پہچان کی کتنی ہی عورتیں آئی تھیں۔ سب یہی کہتی تھیں کہ بچہ باپ پر گیا ہے اور یہ

www.pklibrary.net

بچ ہے۔ بچہ اپنے باپ کی طرح خوب صورت ہے۔ یہ میری طرح نہیں ہے۔ پھر بھی میں فخر کرتی ہوں کہ اتنے خوب صورت بچے کو میں نے جنم دیا ہے۔ جب اس کا باپ اسے دیکھے گا تو مجھ سے زیادہ محبت کرے گا کیونکہ اسے گلاب کا حسن پسند ہے اور میں نے اس کے لیے ایک گلاب کی تخلیق کی ہے۔ مگر افسوس! یہ باپ کی گود میں جانے سے پہلے ہی اس دنیا سے چلا گیا......"

"کیا اس کے باپ نے اسے نہیں دیکھا ہے؟" شادو نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے کہا نا! کہ وہ محکمہ زراعت کے کسی افسر سے ملنے گیا ہے۔ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ ایک ہفتے کے بعد آئے گا۔ اس کے جانے کے بعد یہ پیدا ہوا اور آج اس کا باپ اسے ایک نظر دیکھ لے اور یقین کر لے کہ میں خوب صورت نہ ہونے کے باوجود اس کے لیے خوب صورت بچے پیدا کر سکتی ہوں۔"

"کون کہتا ہے کہ تم خوب صورت نہیں ہو؟ کیا تمہارا خاوند کہتا ہے؟"

"وہ زبان سے نہیں کہتا مگر میں سمجھتی ہوں' حسین گلابوں کو پسند کرنے والا مجھے اوپری دل سے برداشت کرتا ہے۔ میں سوچتی ہوں اگر دوسرا بچہ باپ کی طرح نہ ہوا' میری طرح ناقابل برداشت ہوا تو کیا ہوگا؟ عورت کی ساری عمر سوچتے گزر جاتی ہے کہ وہ مرد کو کس طرح اپنا دیوانہ بنا سکتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ بچہ زندہ ہو جاتا۔"

"تمہیں خدا کی مرضی کے خلاف نہیں سوچنا چاہیے۔ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے تم ایسی بات نہ سوچو جو ناممکن ہو۔"

"بعض عورتیں ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہیں۔" کندن نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں نے کسی کو اطلاع نہیں دی ہے کہ بچہ مر گیا ہے اگر یہاں آس پاس کسی کا مکان ہوتا تو لوگوں کو خود بخود اطلاع پہنچ جاتی۔ میرے آدمی کے کھیتوں میں کام کرنے والے چار مزدور ہیں وہ بھی آج نہیں آئے۔ کسی سے کہتے ہوئے دل دکھے گا کہ اتنی حسین تخلیق ضائع ہو چکی ہے۔ آہ! چھ گھنٹے سے یہ خاموش ہے۔ کچھ بولتا نہیں ہے۔ پلکیں بھی نہیں جھپکتا ہے۔ میں بار بار یہاں آتی ہوں اور اسے دیکھتی ہوں کہ شاید یہ رو دے گا اور میری ضرورت محسوس کرے گا۔ تم کیسے کہتی ہو کہ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے؟ اس عورت کی آنکھوں میں بیٹھ کر دیکھو جس کا بچہ مر چکا ہے۔ تمہیں وہ مردہ

www.pklibrary.net

نہیں آئے گا۔ میں...... میں اس کے باپ کی گود میں اس کا جیتا جاگتا بچہ رکھوں گی۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو ہمیشہ کے لیے اپنے خاوند کو ہار جاؤں گی۔"

شادو سمجھ گئی کہ بچے کی موت سے اس کے دماغ پر برا اثر پڑا ہے۔ اس لیے وہ بے تکی باتیں کر رہی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک اسے ہمدردی سے دیکھتی رہی پھر سر جھکا کر اپنے بچے کی طرف جانے لگی۔ اپنا بچہ جو زندہ تھا...... بچہ زندہ ہو۔ خوب صورت ہو۔ گلاب کی طرح مسکراتا ہو تو خاوند پہلے سے زیادہ بیوی کی قدر کرنے لگتا ہے۔ کندن ٹھیک ہی کہتی تھی۔

رات اندھیری نہیں تھی جب آسمان کے مشرقی کنارے سے چاند طلوع ہوا تو ایک دم سرخ تھا۔ جیسے کسی کے لہو میں ڈوب کر ابھرا ہو پھر رفتہ رفتہ اس کی رنگت بدلنے لگی جیسے عورت اپنا مزاج بدلنے لگتی ہے۔ جیسے خون آشام فطرت کو چھپا کر اجلی چاندنی کی طرح مسکراتی ہے' اسی طرح چاند اپنی اجلی چاندنی سے مسکراتا ہوا روشن ہو گیا۔

تینوں عورتیں باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان گندم کی روٹی' اجلی گھی سے بگھاری ہوئی مونگ کی دال اور لہسن مرچ کی چٹنی رکھی ہوئی تھی۔ کندن اور اس کی ماں برابر لقمے چبائے جا رہی تھیں۔ شادو کے کھانے کی رفتار سست تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ دو چار لقمے زہر مار کر کے سونے چلی جائے گی۔ اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ بھوک سے زیادہ نیند ستا رہی تھی۔

وہ پانی پینے کی بعد اٹھ گئی اور اس کمرے کی طرف جانے لگی جہاں اس کا بچہ سو رہا تھا اور جہاں اسے بھی رات گزارنی تھی۔ دونوں عورتوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ دال کی اس پلیٹ کو دیکھ رہی تھیں جو شادو کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ اور اب تقریباً آدھی خالی ہو چکی تھی۔ وہ باورچی خانے سے باہر آئی تو اس کا سر گھومنے لگا شاید تھکن اور نیند کا نشہ غالب آ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ چاندنی دھوپ کی طرح آنکھوں میں چبھ رہی تھی اور آنگن میں کھلے ہوئے سفید گلاب کے پھول کوڑھ کے داغوں کی طرح لگ رہے تھے۔

وہ چلنے لگی تو پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ وہ لڑکھڑاتی اور سنبھلتی ہوئی دروازے کے نزدیک پہنچی اور نڈھال سی ہو کر دہلیز پر بیٹھ گئی۔ اس میں آگے بڑھنے کی سکت نہیں

www.pklibrary.net

رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ وہیں دہلیز پر سو جائے۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں اس کے جگر کا ٹکڑا سو رہا تھا۔ عورت تھک گئی تھی مگر ممتا تازہ دم ہو گئی۔ وہ چوکھٹ کا سہارا لے کر اٹھی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بچے کی طرف بڑھنے لگی۔

"کیا ہو گیا ہے مجھے......؟" وہ ڈوبتے ہوئے ذہن سے سوچنے لگی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک ایسی تھکن' یا نیند' یا کمزوری اس پر کیسے غالب آ گئی ہے؟ وہ چارپائی پر گر پڑی۔ ہوش کی دنیا سے جاتے جاتے اس نے کروٹ بدلی اور اپنے ایک بازو کے سائے میں بچے کو چھپا لیا۔

پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چہرہ ہر قسم کے جذبے سے عاری ہو گیا اور اس کے رس بھرے ہونٹ ذرا کھل گئے جیسے "ربا" کہتے کہتے کھلے رہ گئے ہوں۔

"ربا! میں بہت دور سے آئی ہوں اور اپنے فرید کے لیے بہت دور تک جاؤں گی۔ اگر تیرے خزانے میں میری زندگی کی سانسیں ختم ہو گئیں ہیں تو ہونے دے مجھے ایسی زندگی دے جو سانسوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ جیسے سرخ گلاب جو سانسیں نہیں لیتا مگر ہنستا' کھلتا' مسکراتا اور مہکتا رہتا ہے۔

میں اتنی دور اپنے لیے نہیں آئی' فرید کے لیے آئی ہوں۔ اسے سرخ گلاب پسند ہیں۔ تو مجھ سے عورت کی زندگی چھین رہا ہے تو چھین لے مگر ایک گلاب کی زندگی دے دے۔ میں اپنے فرید کو مایوس نہیں کرنا چاہتی۔ میں ہمیشہ اس کی نظروں کے سامنے رہنا چاہتی ہوں۔ تو بہت بڑا ہے اور میری دعا بہت چھوٹی ہے۔ قبول کر لے۔"

جیسے پھول کھلتے ہیں۔ ویسے رس بھرے ہونٹوں کی پنکھڑیاں کھل گئی تھیں۔

آسمان پر چاند چمک رہا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے طلسمی رات کی ہتھیلی پر مردہ کھوپڑی مسکرا رہی ہو۔ اس کی روشنی آنگن میں پھیل رہی تھی۔ اور آنگن کے کچے فرش پر دو چڑیلوں کے سائے تھرکتے ہوئے نظر آ رہے تھے

وہ آپس میں سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ منہ سے سانسوں کے بھبکے چھوٹ رہے تھے۔ ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے رات کراہ رہی ہو۔ چڑیلیں کالا منتر پڑھ رہی ہوں۔ پھر وہ دونوں دبے پاؤں چلتی ہوئی دروازے پر آئیں اور چوکھٹ کے دونوں

www.pklibrary.net

طرف کھڑی ہو کر کمرے میں جھانکنے لگیں۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی اونگھ رہی تھی اور گلاب کی کلی اپنی خوشبو کو اپنے بازو میں چھپائے سو رہی تھی۔ وہ دونوں دہلیز پر بیٹھ گئیں۔ ایک بوڑھا جھریوں دار چہرہ تھا جس کے دونوں طرف سفید بال بکھرے ہوئے تھے۔ مردہ کھوپڑی کی طرح اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اور سامنے کے دو دانت نچلے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے تھے۔ وہ دانت کچھ اس طرح نمایاں تھے جیسے خبیث بڑھیا ہنس رہی ہو۔

"ہی ہی ہی۔ بے شک! زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن موت انسان کے ہاتھ میں ہے۔ ایک انسان بڑی آسانی سے دوسرے انسان کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔"

بڑھیا نے دونوں ہتھیلیاں اور گھٹنے زمین پر ٹیک دیے اور چارپائی کی اس سمت رینگنے لگی جدھر بچہ سو رہا تھا۔

دوسری جوان عورت کے بال سیاہ تھے اور چہرے کے اطراف پھیلے ہوئے تھے۔ بال کالے تھے، چہرہ کالا، آنکھیں کالی اور ارادے کالے تھے۔ صرف دانت اجلے تھے اور ان دانتوں کے درمیان ایک خنجر چمک رہا تھا۔ اس نے بھی دونوں ہتھیلیاں اور گھٹنے زمین پر ٹکا دیے تھے اور چارپائی کی اس سمت رینگ رہی تھی جدھر شادو سو رہی تھی۔

ابھی ان کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ فوراً ہی طے نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑی احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ لالٹین کی روشنی سے چھپ کر اور دھیمی سانسوں کا گلا گھونٹ کر بہت آہستہ آہستہ چارپائی تک پہنچنا تھا۔ موت کا یہی دستور ہے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی زندگی تک پہنچتی ہے۔

ابھی ذرا دیر تھی۔ اتنی دیر میں دانتوں کے درمیان چمکتے ہوئے خنجر کی تیز دھار نے کہا۔

"میری خوب صورت سوتن! میرے خاوند کا نام کرم دین نہیں فرید احمد ہے۔ وہی فرید احمد، جس کی آنکھیں نیلی ہیں...... اور جسے سرخ گلاب پسند ہیں۔ اور تو اپنے لباس کی پنکھڑیوں میں سمٹی ہوئی گلاب کی کلی بن کر یہاں آئی ہے۔ کہاں سے یہ حسن چرا کر لائی ہے؟ جب تو بچے کو دودھ پلا رہی تھی تو میں نے تیرے چاندی جیسے بدن کی چکناہٹ دیکھی اور اسے دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ فرید ہر چار پانچ ماہ کے

www.pklibrary.net

بعد جڑانوالہ کیوں جاتا ہے۔ وہ تیرے پاس جاتا ہے۔ حرام زادی! میں تیرے مکھن جیسے جسم کی بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دوں گی۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری......"

کمرے کے کچے فرش پر اس کا سایہ گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا چارپائی کے قریب پہنچ رہا تھا۔ بوڑھی عورت بھی گھٹنوں کے بل بچے کے قریب پہنچ رہی تھی۔ اس کے لانبے نوکیلے دانت ہونٹوں سے باہر نکل کر کہہ رہے تھے۔

"ڈائن اپنے داماد اور اس کے بچے کو کبھی نہیں کھاتی۔ وہ بچہ جو سو رہا ہے' وہ میری بیٹی کی سوت کا ہے مگر میری بیٹی کے خاوند کا بھی ہے۔ سوت مر جائے گی تو بچہ میری بیٹی سے منسوب ہو جائے گا کیونکہ میرے داماد کا بچہ کسی کی بھی کوکھ سے جنم لیتا' وہ ایسا ہی خوب صورت ہوتا۔" اور اس کی آنکھیں نیلی ہوتیں۔ عورت اپنے مرد کو صرف زلف کی زنجیر سے ہی نہیں' اولاد کی محبت سے بھی باندھ کر رکھتی ہے اور اس کی نظروں میں اپنی اہمیت بڑھاتی ہے اور اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ آئندہ بھی ایسے شاہکار پیدا کرتی رہے گی۔

میری بیٹی نے جو بچہ جنا تھا' وہ صبح مر گیا۔ یہ درست ہے کہ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے مگر وہ بچہ اب زندہ ہو جائے گا۔ سوت کی گود سے نکل کر میری بیٹی کی گود میں آجائے گا۔ بعض عورتیں ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہیں......"

چار ہتھیلیاں فرش پر سرکتی ہوئی' چار گھٹنے اپاہجوں کی طرح گھسٹتے ہوئے۔ کبڑی چڑیلیں جھکی ہوئی اور بے رحم موت دانت کٹکٹاتی ہوئی معصوم زندگیوں کے قریب پہنچ گئیں۔

بڑھیا نے بچے کو اٹھایا۔ ممتا کے سائے سے محروم کیا تو وہ اچانک رونے لگا۔

پھر چارپائی پر ہلچل سی مچ گئی۔

"چوں چراں...... چوں چراں......" چارپائی چیخ رہی تھی' احتجاج کر رہی تھی۔ بچہ رو رہا تھا' ممتا کی حرارت کے لیے مچل رہا تھا۔ بڑھیا اسے بازوؤں میں سمیٹے دیوار سے جا لگی تھی اور دیدے پھاڑے وحشت زدہ نظروں سے صید وصیاد کا جنگی تماشا دیکھ رہی تھی۔ تماشہ سامنے بھی تھا اور اس کے پیچھے دیوار پر بھی تھا۔ سینما کے اسکرین کی طرح' دیوار کی اسکرین پر دو سائے گتھم گتھا نظر آرہے تھے۔ خنجر کا سایہ بلند ہو رہا تھا اور نیچے دبے ہوئے سائے میں ڈوب رہا تھا۔ آہیں' کراہیں بچے کی چیخیں۔ رات کا سناٹا لرز رہا

www.pklibrary.net

تھا۔ چارپائی تھرا رہی تھی۔ زندگی پھڑپھڑا رہی تھی۔ پھر ایک آواز ایک آخری چیخ۔
"ربا۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ......."

اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ بڑھیا ننھی سی جان کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔
صبح کاذب کی دھندلی روشنی آنگن میں اتر رہی تھی۔ ڈربے کے اوپر مرغ بانگ دے رہا تھا۔ آنگن پر سایہ کرنے والے درخت پر پرندے شور مچا رہے تھے اور اپنے گھونسلوں سے جھانک کر دونوں ماں بیٹی کو دیکھ رہے تھے؟ وہ دونوں کنویں کے اس پار اکڑوں بیٹھی ہوئی زمین ہموار کر رہی تھیں اور گلاب کے اکھڑے ہوئے ہوئے پودوں کو از سرنو ان کی جگہ ایستادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

جب تمام پودے اپنی اپنی جگہ استحکام سے کھڑے ہو گئے تو بڑھیا ان کی جڑوں میں پانی ڈالنے لگی۔ کندن نے منہ ہاتھ دھو کر بچے کو گود میں لے لیا اور کنویں کے چبوترے پر اطمینان سے بیٹھ کر گلاب کے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ بڑھیا نے اپنی بیٹی کی جانب دیکھا پھر ایک پودے کے پاس زمین پر پاؤں مار کر بولی۔

"جس کا بچہ زندہ تھا' وہ مردہ بچے کے ساتھ یہاں سو رہی ہے۔"

کندن نے اپنی گود کے بچے کو چوم کر کہا۔ "گلاب گونگے ہوتے ہیں وہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکیں گے کہ کس کی چھاتی پر کھل رہے ہیں۔ مگر ماں جی! یہ تمام پودے جڑ سے اکھاڑ دیے گئے تھے۔ اب انہیں دوبارہ لگانے کے بعد کیا ان میں پھول کھلیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ میں نے باغبانی کبھی نہیں کی۔ میں پھولوں اور پودوں کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ میں روزانہ ان کو پانی دوں گی۔ کچھ روز بعد ہی پتہ چلے گا کہ پھول کھلیں گے یا پودے مرجائیں گے۔"

"پودوں کو زندہ رکھنا چاہیے ماں جی! فرید گلابوں کا شوقین ہے اگر یہ مرجھا گئے تو وہ ناراض ہو گا کہ میں نے اچھی طرح ان کی نگہداشت نہیں کی تھی۔"

"ہی ہی ہی۔ تو پگلی ہے۔ اری۔ تیری گود میں ایسا گلاب کھل رہا ہے جسے دیکھ کر فرید سارے تمام گلابوں کو بھول جائے گا۔ جا اب آرام سے جا کے سو جا۔ میں بھی ذرا اپنی مرید سیدھی کروں گی۔"

کندن بچے کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی' اس کمرے میں جہاں پچھلی رات بچہ اپنی

www.pklibrary.net

ماں کے ساتھ سویا تھا۔ اب وہ چارپائی اور بستر دھل گئے تھے اور باہر آنگن میں ڈال دیے گئے تھے تاکہ دھوپ نکلنے پر سوکھ جائیں۔ کمرے میں دوسری منجھی اور بستر آگیا تھا۔ فرش کو مٹی سے لیپ کر تمام سرخ دھبے مٹادیے گئے تھے۔ اب وہاں کسی اجنبی عورت کی آمدورفت کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔ نشانی کے طور پر ایک بچہ تھا جو بول نہیں سکتا تھا۔

بچہ پھر بھی بچہ ہوتا ہے۔ اسے دوسری چھاتیوں سے دودھ مل رہا تھا۔ بڑے بڑوں کو اصلی دودھ نہیں ملتا اس لیے وہ بے چارہ بھی نقلی دودھ سے بہل رہا تھا۔

صبح فصل کی کٹائی کرنے والے مزدور آئے۔ گھر سے درانتیاں لے جاتے وقت انہوں نے بچے کو دیکھا' مسکرائے اور خاموشی سے چلے گئے۔ بھینسوں کا دودھ دوہنے والا بھی آیا۔ وہ باہر دروازے سے ہی برتن مانگتا تھا اور دوہنے کے بعد بھرے ہوئے برتن دروازے پر رکھ کر چلا جاتا تھا۔ اس روز کندن نے دانستہ اسے گھر میں بلایا کہ وہ اندر آکر برتن رکھ جائے۔ گوالے نے پیدائش کے روز اس کے بچے کو ایک بار دیکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آج اس دوسرے بچے کو دیکھ کر وہ اپنی کوئی رائے پیش کرے لیکن اس نے بھی کچھ نہیں کہا' اپنے مالک کے بچے کو دیکھ کر محبت سے مسکرایا اور چلا گیا۔

شام کو قریبی بستی سے دو عورتیں ملنے آئیں۔ یہ وہی عورتیں تھیں جو کندن کی زچگی کے وقت آئی تھیں۔ ایک عورت نے اسے بڑے پیار سے چوم کر کہا۔

"آہا۔ کتنا پیارا بچہ ہے۔ جب پیدا ہوا تھا تو ایسا نہیں تھا۔ کچھ دبلا سا تھا۔ ماشاء اللہ سات دنوں میں کیسے ہاتھ پاؤں نکالے ہیں۔"

دوسری عورت نے کہا۔ "ماں کا دودھ اچھا ہو اور پوری طرح بچے کی نگہداشت ہوتی رہے تو بچہ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ دیکھو نا' بدن میں ذرا گوشت بھرا ہے۔ گال پھولے ہیں تو ناک پکوڑا ہوگئی ہے۔"

پکوڑا کہنے پر عورتیں ہنسنے لگیں۔ ایک نے کہا۔

"ہاں موٹاپے کی وجہ سے بڑا فرق ہو گیا ہے۔ یعنی پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگیا ہے۔ کندن! اسے اور زیادہ خوب صورت نہ بنانا۔ ایسا نہ ہو کہ آئندہ ہم یہاں آئیں تو پہچان ہی نہ سکیں۔"

کندن ہنستے ہوئے بولی۔ خوب سے خوب بنانا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ تو

www.pklibrary.net

قدرت کے کھیل ہیں اور جہاں تک پہچاننے کا تعلق ہے' میں تو یہ کہوں گی کہ انسان بوڑھا ہو یا بچہ' وہ اپنی آنکھوں سے پہچانا جاتا ہے۔ جب یہ پیدا ہوا تھا تو تم نے کہا تھا کہ اس کی آنکھیں نیلی ہیں دیکھو آج بھی وہی آنکھیں ہیں۔"

"سچ کہتی ہو۔ کبھی موٹاپے یا بیماری سے انسان میں بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں لیکن آنکھوں کی رنگت کبھی نہیں بدلتی۔ خدا اسے نظربد سے بچائے رکھے۔ یہ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔"

کندن دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہی تھی کہ بچہ اسی سے منسوب ہو رہا ہے۔ بڑھیا بھی خوش ہو کر ان عورتوں کی تواضع کے لیے دودھ لانے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ ایک عورت نے کہا۔

"ہاں۔ اس کے باپ کے ذکر پر یاد آیا۔ اب اس کی سزا کتنی رہ گئی ہے؟"

"تین ماہ کی قید کی سزا سنائی گئی تھی' ایک مہینہ گزر گیا ہے' دو ماہ کے بعد وہ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا آجائے گا۔ میرے مرد کے نام سے آس پاس کے تمام زمیندار تھراتے ہیں۔"

"یہ تو سچ ہے مگر اب اسے سمجھاؤ کہ اور خون خرابہ نہ کرے۔ اب وہ صاحب اولاد ہو گیا ہے۔ بیوی بچے چھوڑ کر جیل میں زندگی گزارنا اچھی بات نہیں ہے۔"

کندن نے کہا۔ "میں کیا سمجھاؤں بہن! وہ بڑا ضدی ہے۔ کسی بات پر اڑ جائے تو پھر کوئی اسے سمجھا نہیں سکتا اور سچ پوچھو تو غلطی اس کی نہیں تھی۔ رحیم کوٹ کا زمیندار ہمارا پانی کاٹ کر اپنے کھیتوں میں لگا رہا تھا۔ بس اسی پر فرید کو طیش آگیا۔ اس نے زمیندار کے آدمی کو مار مار کر اسپتال پہنچا دیا اور خود تین ماہ کے لیے جیل چلا گیا۔"

اتنے میں بڑھیا گلاسوں میں دودھ لے آئی۔ عورتوں کے ہاتھوں میں دودھ کا گلاس آیا تو پھر دودھ پر ہی باتیں شروع ہو گئیں۔ عورتوں کے پاس باتیں کرنے کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہوتی۔ پیٹ بھر کر باتیں کرنے کے بعد وہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی بستی کی طرف واپس چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد بڑھیا نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

"اب کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے۔ جن عورتوں نے پہلے دن بچے کو گود میں لیا تھا وہ

www.pklibrary.net

آج اسے دیکھ کر پہچان نہ سکیں۔ بچے کا رنگ وہی ہے' آنکھیں وہی ہیں۔ صرف چہرہ ذرا سا مختلف ہے لیکن ایسا بھی فرق نہیں کہ عورتیں اسے فرید کی اولاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیتیں۔ یہ فرید کا ہے۔ فرید کا ہی سمجھا جائے گا۔ گوالے اور کھیت مزدوروں نے ہمارے بچے کو گود میں لے کر قریب سے نہیں دیکھا تھا اس لیے ان کے فرشتوں کو بھی شبہ نہیں ہوگا۔"

کندن نے خوش ہو کر بچے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ سوتن کا بیٹا تھا مگر خاوند کو اپنے آنچل سے باندھ کر رکھنے کے لیے وہ سگے بیٹے کا کردار بننے والا تھا۔ اس لیے وہ سگوں سے زیادہ سگا اور عزیز تھا۔

دوسرے دن ماں بیٹی نے آنگن میں آکر دیکھا۔ پچھلے دنوں جو پھول کھلے تھے۔ وہ اب مرجھا رہے تھے۔ کسی بھی پودے میں ایک بھی نئی کلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کندن نے پریشان ہو کر کہا۔

"ماں جی! یہاں گلاب کھلنے چاہئیں ورنہ فرید بگڑ جائے گا کہ میں نے اس کے لگائے ہوئے پودوں کی حفاظت نہیں کی۔ اگر ایک آدھ پودا مرجھاتا تو کوئی بات نہ تھی مگر یہ تو سب کے سب مرجھا رہے ہیں۔"

بڑھیا نے تشویش سے کہا۔ "پتہ نہیں کیا بات ہے انسان کی کھاد ملنے سے یہ مرجھا گئے ہیں۔ ویسے بھی میں نے کبھی نہیں سنا کہ پودے کسی انسانی لہو سے سینچے گئے ہوں۔"

"سننے کی کیا بات ہے؟" کندن نے کہا۔ "ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ قبروں کے سرہانے خوب پھول کھلتے ہیں' وہاں بھی انسان کے گوشت اور لہو کی کھاد ہوتی ہے؟"

بڑھیا نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ "ہاں..... وہ جانتے ہوں گے کہ پودے مرجھا جائیں تو کیا کرنا چاہیے۔"

اگلے روز کندن اور بڑھیا کے کہنے پر ایک مزدور کنویں کے اس پار گیا۔ گلاب بالکل مرجھا گئے تھے۔ پتیاں بھی کہیں کہیں سے سوکھتی جا رہی تھیں۔ وہ پودوں سے ہری شاخیں کاٹ کر نئے سرے سے گلاب کی قلمیں لگانے لگا۔

دو گھنٹے کی محنت کے بعد نئی قلمیں لگ گئیں اور پرانے پودے نکال کر پھینک دیے گئے۔ اب وہاں کی زمین ننگی ہو گئی تھی۔ صرف پتلی پتلی ہری شاخیں بھربھری مٹی میں

www.pklibrary.net

دھنسی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کچھ دیر پہلے وہاں پر پودے تھے۔ وہ بے شک مرجھائے ہوئے تھے مگر ان کے جرم کو چھپانے کے لیے زمین کو اپنی شاخوں اور پتیوں سے ڈھانپے ہوئے تھے۔

مزدور اس زمین کو پانی سے سینچ کر چلا گیا۔ دونوں ماں بیٹی بہت دیر تک وہاں کھڑی رہیں اور متوحش نظروں سے یوں دیکھتی رہیں جیسے وہ زمین ابھی ایک تعویز کی طرح کھلے گی اور وہاں سے سرخ لباس کی پنکھڑیوں میں سمٹی ہوئی گلاب کی کلی ابھر کر ان کے سامنے آجائے گی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر کہے گی۔

"لاؤ میرا بچہ واپس کردو۔ میں محبت کا وہ ننھا سا حسین تحفہ اپنے فرید کو پیش کروں گی۔"

کندن گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بڑھیا بھی تصور میں وہی منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے بیٹی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں اسے تسلی دی۔

"بیٹی گھبراؤ نہیں کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر یہاں نئی کونپلیں پھوٹیں گی، شاخیں پھیلیں گی، پتیاں بکھریں گی اور یہ زمین چھپ جائے گی۔

بالکل چھپ جائے گی۔ اور پھول کھل جائیں تو ان کی رنگینیوں کی تہہ میں کسی کا لہو نظر نہیں آتا۔ گھبراؤ نہیں بیٹی! وہ اب تک کیڑوں کی خوراک بن چکی ہوگی....."

پھر دن گزرنے لگے۔ مزدور صبح و شام آکر گلاب کی تیلی تیلی شاخوں کو پانی دیتا تھا۔ پہلے پہلے کچھ پتہ نہ چلا، ماں بیٹی مایوس ہو رہی تھیں کہ وہ تراشیدہ شاخیں گل نہیں کھلائیں گی۔ پھر ایک صبح ان میں روئیدگی کے آثار نظر آئے۔ محنت رائگاں نہیں گئی۔ رفتہ رفتہ شاخوں سے شاخیں پھوٹنے لگیں۔ سبز ملائم پتیاں آنکھیں کھولنے لگیں۔ پودے اونچے ہونے لگے۔ کندن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے فرید کے لگائے ہوئے پودوں کو بحال کر دیا تھا۔ زمین کا وہ حصہ چھپ گیا تھا۔ ان کے جرم پر سرسبز و شاداب پودوں کا پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ روز صبح اٹھ کر دیکھتی تھی۔ اب کتنی ہی شاخوں میں کلیاں نظر آنے لگی تھیں۔

ٹھیک ہے کہ تمام ثبوت مر گئے تھے۔ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن ان کی خوشیاں دیرپا نہیں تھیں۔ ایک صبح انہوں نے کنویں کے اس پار دیکھا تو ان کے کلیجے

www.pklibrary.net

دھک سے رہ گئے۔

وہاں جتنی بھی کلیاں تھیں، ان کے منہ ذرا سے کھل گئے تھے اور ہر ایک کے منہ پر لہو کی سرخی جھلک رہی تھی۔

ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جہاں تک پودے نظر آرہے تھے۔ وہاں تک خون کے چھینٹے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ مرنے والی ان کلیوں کے کنوارے لبوں پر اپنے لہو کو قطرہ قطرہ تقسیم کر رہی تھی۔ وہ دونوں لرزتے ہوئے قدموں سے جھجکتی ہوئی ذرا قریب آکر دیکھنے لگیں۔

"کیا ہو گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ماں جی...... اس کا خون چغلی کھا رہا ہے۔"

"نن...... نہیں بیٹی! ہوش کی باتیں کرو۔ یہ خون نہیں ہے۔ یہ سرخ کلیاں ہیں۔"

"ہاں وہ سرخ کلیاں تھیں۔ شام کو وہ ذرا اور کھل گئیں اور دوسری صبح پھول بن گئیں۔ سرخ گلاب کے پھول۔ جیسے وہ پھول نہیں تھے، شادو کا سرخ پیراہن تھا اور وہ اس پیراہن میں چھپی ہوئی یہاں کھل رہی تھی، مسکرا رہی تھی، خوشبو لٹا رہی تھی، شاخوں کے جھولے پر جھول رہی تھی......"

کندن بوکھلائی ہوئی ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ کبھی کنویں کے پاس بیٹھتی تھی۔ کبھی اٹھ کر دور چلی جاتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ کتنے پھولوں کو قتل کرے؟ کتنوں کو دفن کرے؟ دفن کرے گی اتنے ہی پھول اور کھلیں گے۔ جو چپ رہے گی زبان خنجر، لہو پکارے گا آستین کا۔ شادو مٹی کی تہہ سے پکار رہی تھی۔

آہ! اب وہ ان پودوں کو اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتی تھی۔ فرید کی سزا کی میعاد پوری ہو چکی تھی۔ وہ کسی بھی دن وہاں پہنچ سکتا تھا۔ وہ بڑے فخر سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ دیکھو فرید، میں نے تمہارے لگائے ہوئے پودوں کی حفاظت کی ہے مگر..... مگر......جہاں سفید گلاب کھلتے تھے۔ وہاں سرخ گلاب کیسے کھل رہے ہیں؟

کیسے کھل رہے ہیں؟ اس کا جواب پودے، مٹی اور کھاد کے رشتے ہی دے سکتے ہیں یا پھر شادو کی خاموش دعا کچھ کہہ سکتی ہے۔

"ربا! مجھے ایسی زندگی دے جو سانسوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ جیسے سرخ گلاب، جو سانس نہیں لیتا مگر ہنستا، کھلتا، مسکراتا اور مہکتا رہتا ہے۔ تو مجھ سے عورت کی زندگی چھین

www.pklibrary.net

رہا ہے تو چھین لے مگر ایک گلاب کی زندگی دے دے۔ میں اپنے فرید کے سامنے ہمیشہ مسکرانا چاہتی ہوں۔ ربا' تو بہت بڑا ہے اور میری دعا بہت چھوٹی ہے۔ قبول کر لے......"
اور وہ لہو کے گلاب مسکرا رہے تھے۔

○☆○

وہ جیل سے رہا ہو کر ایگر کلچرڈ یپارٹمنٹ کے ایک دفتر میں آیا۔ وہاں اس نے اپنے ایک دوست ظفر علی کے پاس پانچ سو روپے رکھوائے تھے۔ وہ جیل سے خالی ہاتھ نکلا تھا۔ لہذا اسے روپے کی ضرورت تھی۔ ظفر علی بڑے تپاک سے ملا اور اسے اپنے گھر لے گیا۔ فرید نے اس سے کہا۔

"ظفر! میں یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتا ابھی دوپہر کی ٹرین سے لاہور جاؤں گا۔"

"لاہور؟" اس نے تعجب سے کہا۔ تین ماہ بعد جیل سے رہا ہو کر آ رہے ہو۔ وہاں عثمان گوٹھ میں تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہو گی اور تم لاہور جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ وہاں بھی کسی کو میرا انتظار ہو گا۔" فرید نے سر جھکا کر ندامت سے کہا۔

"میں اس پر ظلم کر رہا ہوں۔ میں اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہوں۔ اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے۔ اسی لیے میں لاہور جانا چاہتا ہوں۔ لاہور سے جڑانوالہ جاؤں گا اور اسے ساری حقیقت بتادوں گا۔ بتاؤں گا نہیں بلکہ اسے اپنے ساتھ عثمان گوٹھ لے آؤں گا۔ وہاں پہنچ کر اسے پتہ چل جائے گا کہ میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔"

"دوسری شادی؟" ظفر نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم نے جڑانوالہ میں دوسری شادی کی ہے؟"

"نہیں۔ وہ میری پہلی شادی تھی۔ شادو میری پہلی بیوی ہے۔ سنا تھا کہ شادی کے بعد عورت رسمی طور پر بیوی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس میں پہلی جیسی محبوبیت نہیں رہتی لیکن وہ اتنی اچھی اتنی حسین اور محبت کی ماری ہے کہ میں آج بھی ایک عاشق کی طرح اس کے لیے تڑپتا رہتا ہوں۔"

تم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا؟ مجھ جیسے دوست سے بھی یہ بات چھپانے کا مطلب یہ ہے کہ شادو کے پیچھے کوئی گہرا راز ہے۔"

"کوئی راز نہیں ہے۔ وہاں لاہور میں' میں بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ مجھے شادو

www.pklibrary.net

جیسی بیوی ملی ہے مگر جب سے عثمان گوٹھ میں دوسری شادی کی ہے، اس وقت سے میں خود کو مجرم سمجھ رہا ہوں۔ کیا شادو جیسی محبت کرنے والی حسین اور وفا شعار بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا جرم نہیں ہے؟"

"تو پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "یار یہ سمجھ لو کہ انسان اپنی زندگی میں کبھی کبھی زبردست حماقتیں کرتا ہے۔ مجھ سے بھی یہ حماقت ہو گئی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھ سے ایسی غلطی ہو جائے گی۔"

"جب شادو میری دلہن بن کر آئی تھی تو ان دنوں میں بہت غریب تھا۔ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا۔ مل گئی تو روزی، نہیں تو روزہ رکھنے والی بات تھی۔ شادو نے میرے ساتھ رہ کر دو دو چار چار وقت کے مسلسل فاقے کئے ہیں۔ یہ سوچ کر مجھے ندامت سی ہوتی ہے کہ وہ میرے برے وقتوں کی ساتھی تھی اور اچھا وقت آیا تو میں اسے اپنے سے جدا رکھتا ہوں کہ کہیں اس پر دوسری شادی کا بھید نہ کھل جائے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری غربت کو تو برداشت کر سکتی ہے لیکن میری بے وفائی کا صدمہ برداشت نہیں کرے گی۔

مفلسی کے دنوں میں ہمارے خواب ایک جیسے تھے۔ ہم دونوں سوچتے تھے کہ کبھی ہمارے دن بھی پھریں گے۔ ہمارا ایک چھوٹا سا مکان ہو گا اور اس کے آنگن میں گلاب کھلیں گے، سرخ گلاب کے پھول۔ مجھے سرخ گلاب پسند ہیں۔ آج بھی جب وہ سرخ لباس پہنتی ہے تو اس گلاب سے مکھڑے کو دیکھ کر میرے خواب پورے ہو جاتے ہیں۔

پھر مجھے زمینیں حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ محکمہ زراعت سندھ کے افسران نے ایک اسکیم بنائی کہ غلام محمد بیراج اور سکھر بیراج سے نہریں نکال کر دور افتادہ علاقوں تک پہنچائی جائیں تو سندھ کی بنجر زمینیں قابل کاشت بنائی جا سکتی ہیں۔ حکومت نے اعلان کیا کہ ان علاقوں میں ہل چلانے والے کسانوں کو مفت زمینیں دی جائیں گی۔

وہ بنجر زمینیں جو صدیوں سے پیاسی تھیں جہاں کبھی سبزہ نہیں اگتا تھا۔ وہاں کی دھرتی پر ہل چلانا اور فصل اگانا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ تم اس محکمے میں ہو۔ تم جانتے ہو کہ آج بھی یہ کسان ان علاقوں میں کس طرح اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔

www.pklibrary.net

مجھے بھی اپنے حوصلے کو آزمانے کا موقع ملا۔ میں شادو کو اس کے میکے میں چھوڑ کر یہاں آ گیا یہاں عثمان گوٹھ میں زمین مل گئی۔ میری زمینوں کے ساتھ جو دوسری زمینیں تھیں وہ بورے والا کے ایک بوڑھے زمیندار رحیم بخش کو ملی تھیں۔ وہ بوڑھا اپنے جوان بیٹے کے ساتھ کھیتی باڑی کے لیے آیا تھا۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ چھ ماہ کے بعد اس کا جوان بیٹا مر گیا۔

میں نے بوڑھے رحیم بخش کو تسلی دی کہ وہ حوصلہ نہ ہارے۔ میں اس کے کھیتوں کا کام سنبھال لوں گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہمدردی مہنگی پڑے گی۔ میں نے پوری دیانت داری سے اس کا کام سنبھالا۔ کھیت مزدوروں کے ساتھ مل کر دن رات محنت کی۔ وہاں کی مٹی کو ہلوں اور مزدوروں کی محنتوں سے آشنا کیا۔ کھیت جاگے، فصلیں جوان ہوئیں، آمدنی بڑھی۔ میں نے رہائش کے لیے ابھی مکان نہیں بنایا تھا ورنہ شادو کو اپنے پاس بلا لیتا۔ لیکن اسے زیادہ سے زیادہ پیسے بھیجتا رہا۔ سال میں دو ایک بار ملنے چلا جاتا تھا۔ بوڑھے رحیم بخش نے اپنا مکان بنوالیا تھا اس لیے اس نے اپنی بیٹی اور بیوی کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہی بیٹی جو آج میری دوسری بیوی ہے۔

میں نے کبھی رحیم بخش کے سامنے شادو کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ بوڑھا تھا اور میں جوان۔ ایک بوڑھے کے سامنے اپنی جوان بیوی کی داستان لے کر بیٹھنا حماقت تھی اور جب اس گھر میں ایک جوان لڑکی آئی تو میں مزید حماقتوں میں مبتلا ہو گیا۔ لڑکی بے باک تھی گرم گرم نگاہوں سے دیکھتی تھی، مسکراتی تھی، کبھی موقع ملے تو چھیڑ کر گزر جاتی تھی۔ میں دن بھر کی محنت سے تھکا ہوا آتا تھا۔ شادو سے سیکڑوں میل دور تھا۔ ادھر کندن اپنی اداؤں اور معنی خیز اشاروں سے کچھ سمجھاتی تھی اور میں سمجھ جاتا تھا۔

لیکن میں سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے سمجھنے کے لیے جڑانوالہ میں شادو موجود تھی۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضرورتیں بڑھ جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں آدمی کچھ زیادہ ہی سمجھنا چاہتا ہے، عقلی طور پر نہیں جذبات کی آنچ پر جو بہت تیز ہوتی ہے۔ فولاد کو بھاپ بنا کر اڑا دیتی ہے۔ میں بھی فولاد کی طرح پگھل گیا تھا۔

○☆○

چنانچہ جب وقت گزر گیا۔ جب جذبات سرد پڑ گئے تو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تب

www.pklibrary.net

دیر ہو چکی تھی۔ رحیم بخش نے بھی فولاد کے تپھلنے کا تماشا دیکھ لیا تھا
اب یہ کہنے کا وقت نکل چکا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں اور وہ بھی میری یہ بات سننے کے مقام سے آگے نکل چکا تھا۔ بوڑھے نے سر جھکا کر کہا۔
میں نے کھیت تمہارے حوالے کر دیے' بیٹی بھی تمہارے حوالے کرنے والا تھا۔ بہرحال اس سلسلے میں بات بڑھانا دانش مندی نہیں ہے۔ اس میں ہم سب کی بد نامی ہے۔ کل تم دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"
یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ بڑھیا بھی چلی گئی۔ اس کی بیٹی بھی چلی گئی اور میں تنہا ایک مجرم کی طرح بیٹھا رہ گیا۔ چوری پکڑی گئی تھی اس لیے میں بوڑھے کے فیصلے سے انکار نہ کر سکا۔

اب کندن میری بیوی ہے۔ یہ بات میں آج تک شادو کو نہ بتا سکا۔ کئی بار بتانے کی کوشش بھی کی مگر اس کی محبت اس کی معصومیت اور اس کا بے پناہ اعتماد دیکھ کر میں چوروں کی طرح چپ سادھ لیتا ہوں۔ وہ ضد کرتی ہے کہ میں اسے اپنے ساتھ یہاں لے آؤں لیکن میں بہانے کرتا ہوں' باتیں بناتا ہوں کہ یہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے۔ پانی کی قلت ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں میلوں دور سے لانا پڑتی ہیں۔ آس پاس کوئی مکان نہیں ہے چور ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے۔ ایسی صورت میں' میں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔
بارہا سمجھانے کے باوجود وہ بضد ہے کہ میرے ساتھ رہے گی۔ پچھلی بار جب اس سے مل کر آیا تو یہ وعدہ کیا تھا کہ چار ماہ کے بعد اسے بلا لوں گا۔ ایک ماہ کے بعد اس کا خط آیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اسے کچھ دن اور ٹالنے کا بہانہ مل گیا۔ میں نے لکھ دیا کہ زچگی کے بعد میں اسے لے آؤں گا۔ میں بہت مجبور ہو کر اسے ٹال رہا تھا مگر اب میری بے چینی بڑھ گئی تھی۔ ایک تو شادو کی محبت ہی کچھ کم نہ تھی۔ دوسرے اب وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس طرح وہ میری محبت کو میری آئندہ نسل تک پہنچا رہی تھی۔
اس بار میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی زچگی کے بعد اسے ضرور یہاں لے آؤں گا اور یہ بات میں نے کندن کو بتا دی۔ اپنی سوکن کا ذکر سن وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کی بوڑھی ماں نے مجھے برا بھلا کہتے ہوتے ہوئے یہ بات بتائی کہ کندن بھی ماں بننے والی ہے۔ ایسی حالت میں اسے صدمہ پہنچانے والی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ کندن کا باپ

www.pklibrary.net

رحیم بخش چھ ماہ پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ دونوں ماں بیٹی میرے رحم و کرم پر ہیں۔ میں نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ایسے وقت عورت پر رعب جما کر ہی اسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی سوکن کو برداشت کر لے۔ میں جانتا ہوں شادو بھی اسی طرح روئے گی پھر حالات سے سمجھوتہ کر لے گی۔ میری کمزوری صرف اتنی سی ہے کہ میں شادو کے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ظفر علی نے کہا۔

"شادو کے آنسو تو دیکھنے ہی پڑیں گے۔ غلطی تم نے کی ہے۔ زندگی بھر رونے کی سزا اسے ملے گی۔"

"خدا نہ کرے کہ اسے میری غلطی کی سزا ملے۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح منا لوں گا۔"

وہ اپنی نگاہوں کے سامنے شادو کی تصویر بنانے لگا۔ کاجل بھری کٹورا سی آنکھیں، دودھ جیسے اجلے چہرے پر چھلکتی ہوئی گلابی رنگت، لبوں کی لالیاں سنہری زلفیں شانوں پر بکھرنے کے لیے لہرا رہی تھیں۔ جتنے رنگ گلاب کے پھولوں میں نہیں ہوتے، اتنے رنگ اس ایک حسینہ میں سمٹ آئے تھے۔

"شادو میری گلاب کی کلی! تم عثمان گوٹھ آؤ گی تو میں تمہیں دکھاؤں گا کہ میں نے آنگن میں گلاب کے پودے لگائے ہیں مگر وہاں سفید گلاب کھلتے ہیں۔ تم آؤ گی تو ان گلابوں میں شاید تمہارے شبابی وجود کی رنگت گھل جائے گی......"

وہ رنگت گھل چکی تھی اور وہ سوچنے والا خیال ہی خیال میں اسے اس آنگن تک بلا رہا تھا جہاں وہ پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور اپنے لہو کی سرخی میں ڈوب کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"آؤ فرید۔ تم اپنے آنگن میں پھول کھلانا چاہتے تھے، آؤ میں سرخ پیراہن میں کھل رہی ہوں۔"

سہاگ رات کو تم نے سرخ گھونگٹ اٹھا کر کہا تھا کہ میں تمہاری نگاہوں کی آسودگی کے لیے کبھی کبھی وہ لباس پہن لیا کروں سو میں نے سدا سہاگن کا وہ لباس پہن لیا ہے۔ آؤ۔ مجھے پہچان سکو تو پہچان لو......"

www.pklibrary.net

ابھی آنگن اس سے دور تھا۔ وہ اپنی محبوبہ سے ملنے اس کے میکے کی طرف چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شادو نے اسے کئی خط لکھے۔ صرف پہلے خط کا جواب ملا۔ اس کے بعد فرید کی مسلسل خاموشی سے وہ پریشان ہوگئی اور زچگی کے پندرہ دن بعد تیس جون کو وہاں سے عثمان گوٹھ چلی گئی۔ تب سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی ہے اور نہ ہی اس نے میکے والوں کو خط لکھا ہے۔

فرید اسی دن وہاں سے لوٹ گیا۔ سفر کے دوران وہ سوچتا رہا کہ شادو کو ایک ننھی سی جان کے ساتھ تنہا اتنا طویل اور انجانا سفر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ بے چاری اور کیا کرتی۔ برسوں کے بہلاوے اور انتظار سے تنگ آگئی ہوگی۔ اسے خطوط کے جوابات نہیں مل رہے تھے۔ کوئی خبر نہیں مل رہی تھی کہ خاوند کہاں گم ہوگیا ہے اس لیے وہ پریشان ہو کر اس کی تلاش میں نکل آئی ہوگی۔ وہ بھی مجبور تھی۔ یہ بھی مجبور تھا۔ شادو کا دوسرا تیسرا خط آتا تھا لیکن وہ رحیم کوٹ کے زمیندار سے نہری پانی کے جھگڑوں میں الجھا ہوا تھا۔ تھانہ کچہری اور کھیتی باڑی کی الجھنوں سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ پھر عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف ہوگیا تو وہ تین ماہ کے لیے جیل کی چار دیواری میں قید ہوگیا۔ انہی الجھنوں اور بکھیڑوں کا نام زندگی ہے۔

جڑانوالہ سے شور کوٹ۔ شور کوٹ سے شداد پور پھر وہاں سے عثمان گوٹھ۔ شادو اس کی تلاش میں ان راستوں سے گزرتی آئی تھی۔ اب انہی راستوں پر وہ شادو کو تلاش کرتا آرہا تھا۔

اپنے کھیتوں سے گزرتے ہوئے اس نے مزدوروں سے پوچھا۔

"میرے ہاں کوئی عورت آئی ہے جس کے ساتھ ایک بچہ ہے۔"

"نہیں۔" جواب ملا۔ اس نے مایوسی اور پریشانی سے پوچھا۔ "کوئی مہمان عورت۔ ایسی عورت جو مجھے تلاش کرتی آئی ہو اور پھر چلی گئی ہو؟"

"نہیں۔ یہاں صرف بستی کی عورتیں آتی ہیں۔ گھر میں مالکن اور بوڑھی مالکن کے سوا ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ ہاں' آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے بہت ہی خوب صورت ہے۔ میری گھروالی کہہ رہی تھی کہ وہ بالکل آپ جیسا ہے۔"

فرید کسی خوشی کا اظہار کئے بغیر لانبے لانبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے مکان کی طرف

www.pklibrary.net

جانے لگا۔ اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ شادو یہاں تک کیوں نہیں پہنچی۔ صحیح پتہ معلوم ہونے کے باوجود وہ کہاں بھٹک گئی ہے؟ کہیں وہ اکیلی عورت کسی بد معاش کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو۔

اس نے دروازے پر پہنچ کر زور زور سے دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی تو وہ دھڑا دھڑ گھونسے برسانے اور چیخنے لگا۔

"کندن۔! دروازہ کھولو کیا مرگئی ہو' سنائی نہیں دیتا ہے؟"

فرید کی آواز سنتے ہی کندن آنگن سے دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور خوشی سے چیختے ہوئے بولی۔ "آتی ہوں۔۔ آرہی ہوں۔ ابھی دروازہ کھولتی ہوں۔" وہ بھاگتی ہوئی چار پائی کے پاس آئی اور وہاں سے بچے کو اٹھا کر گنگناتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اٹھ منے! دیکھ تیرا باپ آیا ہے۔ وہ تجھے دیکھتے ہی مارے خوشی کے مجھے چوم لے گا۔"

وہ لہراتی اور اٹھلاتی ہوئی دروازے کے پاس آئی اور اسے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی فرید نے بے تابی سے پوچھا۔

"شادو یہاں آئی ہے؟"

کندن کے دماغ میں ہتھوڑا سا لگا۔ پل بھر کے لیے یوں لگا جیسے فرید کو یہاں شادو کی آمد کا کوئی ثبوت مل گیا ہے۔ تب ہی وہ جیل سے آتے ہی پورے یقین سے کہہ رہا ہے کہ شادو یہاں آئی ہے مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر بولی۔

"شادو؟...... کون شادو؟ کیا وہ جو تمہاری سگی ہے؟ وہ بھلا میرے پاس کیوں آنے لگی؟"

"وہ آئی ہے۔" اس نے پاؤں پٹخ کر چیختے ہوئے کہا۔ "وہ یہاں آئی ہے۔ میں اس کے میکے سے آرہا ہوں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ دو ماہ پہلے اپنے گھر سے نکلی ہے۔ مجھ سے ملنے یہاں آئی ہے۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "وہ یہاں آتی تو کیا میں اسے کنویں میں پھینک دیتی یا اسے کچا کھا جاتی یا اسے ذبح کر دیتی۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ اتنی بڑی عورت بھلا کہیں چھپ سکتی ہے؟ میری بات کا یقین نہیں ہے تو گھر میں آکے دیکھ لو۔ تم تو دروازے پر ایسے کھڑے ہو

www.pklibrary.net

جیسے کوئی پولیس والے ہو۔ جیسے یہ تمہارا گھر نہیں ہے' میں تمہاری نہیں ہوں' یہ بچہ تمہارا نہیں ہے......."

بچے کے ذکر پر فرید نے پہلی بار اس ننھی سی جان کو دیکھا تو چند لمحوں کے لیے نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ وہ دہلیز پار کر کے قریب آیا اور جھک کر غور سے اسے دیکھنے لگا۔ کندن یوں فاتحانہ انداز میں کبھی بچے کو اور کبھی فرید کو دیکھ رہی تھی جیسے کوئی شکاری جال بچھا کر کبھی اپنے جال کو اور کبھی پھنسنے والے شکار کو دیکھتا ہے۔

فرید کچھ اور ہی دیکھ رہا تھا نہ جانے کیوں اس بچے کو دیکھتے ہی شادو کچھ اور شدت سے یاد آگئی تھی۔ اس بچے میں کوئی بات تھی کوئی ایسی چیز تھی جو اپنی بچھڑی ہوئی ماں کی نمائندگی کر رہی تھی حالانکہ آنکھیں باپ کی طرح نیلی تھیں' ناک نقشہ بھی باپ ہی سے ملتا جلتا تھا مگر اس کے بال سنہرے تھے جب کہ فرید کے بال سیاہ تھے۔ وہ سنہری چمک اسے اپنی ماں سے ملی تھیں۔

ان سنہرے بالوں کو دیکھ کر اسے شادو کی زلفیں یاد آرہی تھیں۔ کندن کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ سیکڑوں میل دور رہنے والی شادو کی سنہری چمک کیسے چرا لایا؟ یہ سوال ذرا دیر کے لیے اس کے ذہن میں ابھرا پھر ڈوب گیا کہ یہ محض اتفاق ہے۔ ایسے ہی اتفاقات قدرت کی بوالعجبی سمجھے جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس وقت وہ شادو کے لیے فکر مند تھا۔ اس نے کندن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

"تم نے مجھے بہت ہی خوب صورت بیٹا دیا ہے۔ میں اسے پیار کروں گا۔ خوب پیار کروں گا مگر ابھی میں بہت پریشان ہوں۔ شادو کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ نہ جانے وہ صحیح پتے سے بھٹک کر کہاں چلی گئی ہے؟"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا اور تیزی سے چلتا ہوا کندن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ ذرا دم لینے کے لیے بھی ٹھہرا نہیں' اس نے کندن کی خیریت بھی نہیں پوچھی اور پلٹ کر چلا گیا۔ ٹھیک ہے کہ وہ پریشان تھا مگر وہ پریشانی سوکن کے لیے تھی۔ اس لئے دل میں چرکے لگ رہے تھے۔

وہ خود کو سمجھانے لگی کہ کوئی بات نہیں۔ ایک خاوند اپنی گمشدہ بیوی کے لیے کتنے دنوں تک پریشان رہے گا؟ ابھی اسے تلاش کرنے دو۔ وہ تھک ہار کر صبر کرنے پر مجبور

www.pklibrary.net

ہو جائے گا۔ پھر میں تنہا اس کی نگاہوں کا مرکز بنی رہوں گی۔ یہی کیا کم ہے کہ اس نے میری تعریف کی ہے کہ میں نے اس کے لیے ایک خوب صورت بیٹا پیدا کیا ہے۔

اس نے بچے کو سینے سے لگا کر چوم لیا۔ بے چاری مرنے والی نے اس کے لیے اس بچے کو جنم دیا تھا۔

فرید بستی میں جا کر جان پہچان والوں سے شادو کے متعلق پوچھتا رہا پھر اس نے تھانے میں جا کر رپورٹ لکھوادی۔ تھانیدار نے کہا کہ وہ ۳۰ جون کو جڑانوالہ سے چلی تھی۔ تو پہلی جولائی کو شہداد کوٹ پہنچی ہوگی۔ میں ریلوے پولیس کے رجسٹر سے معلوم کروں گا کہ پہلی جولائی کو شہداد کوٹ کے اسٹیشن پر کون کون سے سپاہی ڈیوٹی پر تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایک تنہا عورت کو بچے کے ساتھ دیکھا ہو۔ تم شادو کی ایک تصویر ہمیں لا دو اگر وہ شہداد کوٹ تک آئی ہوگی تو کوئی نہ کوئی اسے پہچان لے گا۔

فرید نے شادو کی ایک تصویر لے کر تھانے پہنچا دی اور گھر واپس آ گیا لیکن اطمینان سے نہ بیٹھ سکا اور دوبارہ باہر نکل کر آس پاس کے زمینداروں سے پوچھتا رہا حتیٰکہ ان زمینداروں کے پاس بھی گیا جن سے جھگڑا کر کے وہ جیل گیا تھا مگر ناکامی ہوئی۔ کسی نے بھی شادو کا سایہ تک نہیں دیکھا تھا۔

وہ آدھی رات کو گھر واپس پہنچا تو تھکن سے چور تھا۔ نہ بچے کو چوم سکا اور نہ ہی وہ کندن سے محبت کے دو بول کہہ سکا۔ بستر پر گرتے ہی گہری نیند سو گیا۔

کندن تمام رات اپنی چارپائی پر کروٹیں بدلتی رہی اور فرید کی بے اعتنائی اور بے مروتی پر جھنجلاتی رہی۔ اتنے دنوں بعد آیا تھا اور ایسے الگ تھلگ سو رہا تھا۔ جیسے آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ وہ صبح اٹھی تو روٹھی ہوئی تھی۔ فرید نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ آنکھ کھلتے ہی وہ شادو کی گمشدگی کے متعلق سوچ رہا تھا۔

وہ بستر سے اٹھ کر سوچ میں ڈوبا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ اتنے دنوں بعد پہلی بار آنگن میں آیا تھا۔ پھر سرخ گلابوں کو دیکھتے ہی اس کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ اس نے خوشی سے چیختے ہوئے کندن کو آواز دی۔

"کندن۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ ہمارے ہاں سرخ گلاب کھل رہے ہیں۔ یہ سب کیسے ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ سفید گلاب سرخ کیسے ہو گئے؟"

www.pklibrary.net

بڑھیا نے باورچی خانے سے نکل کر کہا۔ "بیٹا۔ یہ سب خدا کی قدرت ہے۔ تم نے جو پودے لگائے تھے وہ سوکھ چلے تھے۔ تمہارے مزدوروں نے انہی پودوں کی شاخیں کاٹ کر دوبارہ لگا دی تھیں۔ کندن دن رات ان کی دیکھ بھال کرتی رہی۔"

فرید پودوں کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ وہ دیوانہ وار ایک ایک پودے کے قریب جاتا' اس کی ریشمی پنکھڑیوں کو لرزتی ہوئی انگلیوں سے چھو رہا تھا۔ کندن دروازے پر کھڑی دانت پر دانت جمائے ہونٹوں کو سختی سے بھینچے ان گلابوں کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنی سوکن کو دیکھ رہی ہو۔ فرید نے کبھی اسے اتنی توجہ سے نہیں دیکھا تھا مگر گلابوں کو دل کی گہرائیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے کبھی اتنی نرمی سے ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر سوکن کے سرخ پیراہن کو چھو رہا تھا۔

اب وہ ایک پودے کے قریب دوزانو ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اور ایک پھول کو دونوں ہاتھوں سے یوں تھام رہا تھا جیسے شادو کے شہابی مکھڑے کو ہتھیلیوں کے گلدان میں سجا رہا ہو۔

وہ گلاب کی پتیوں میں چھپی ہوئی شبنم کے آنسو رو رہی تھی۔ شاید وہ خوشی کے آنسو تھے کہ ایک مدت کے بعد اس کی قربت نصیب ہوئی تھی۔

فرید محبت اور لگن سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور تب آنکھیں بند کرتے ہی اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کی تلاش ختم ہو گئی ہو۔

جان بہار اس کے ہونٹوں کے سائے میں ہے' وہی رنگ' وہی روپ۔ وہی جذبوں سے مہکتی ہوئی گلابی خوشبو' وہی گلبدن کی نزاکت اور ملامت جو سمٹے تو پھول اور انگڑائی کی اٹھان پر آئے تو شادو کا سراپا بن جائے۔

آگ لگ رہی تھی۔

آگ لگ رہی تھی۔ کندن جل رہی تھی۔ وہ سرخ گلاب نہیں تھے' انگارے تھے جو اس کے جسم کے ہر ایک حصے کو داغ رہے تھے۔ وہ تڑپ رہی تھی اور اپنے اندر چیخ رہی تھی۔ "اری۔! تجھے کس لیے مارا تھا؟ کیا اس لیے کہ مرنے کے بعد بھی تو مجھے جلاتی رہے اور سوکن بن کر میرے خاوند کا راستہ کاٹتی رہے۔ کل سے میری سیج سونی ہے۔ ہائے' وہ

www.pklibrary.net

میری طرف ذرا بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا.........''

وہ دوڑتی ہوئی اپنی ماں کے کمرے میں گئی اور بستر پر اوندھے منہ گر کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد ماں نے آکر بتایا کہ فرید ناشتہ کیے بغیر تھانے چلا گیا ہے۔ بس یہی باتیں جی کو جلاتی تھیں کہ اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں ہے۔ بیوی بچے کی پروا نہیں ہے' رات کو مسافر کی طرح آیا اور صبح اٹھ کر سوکن کو گلے لگایا' اسے پیار کیا اور چلا گیا۔

وہ غصے میں تنتناتی ہوئی کمرے سے نکلی' آنگن میں آئی اور غراتے ہوئے ان گلابوں کو دیکھنے لگی پھر پاؤں پٹختے ہوئے اس پھول کے پاس گئی جسے وہ چوم کر گیا تھا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ غصے کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دایاں ہاتھ اٹھایا اور اپنی پوری طاقت سے اس پھول کو ایک طمانچہ مارا۔

''ہائے!'' ایک زور کی چیخ بلند ہوئی۔

وہ پھول کی چیخ نہیں تھی۔ کندن چیختی چلاتی وہاں سے بھاگی آرہی تھی۔ ماں نے کمرے سے نکل کر پریشانی سے پوچھا۔

''کیا بات ہے بٹیا؟ کیا ہو گیا......؟''

بٹیا بیچ آنگن میں آکر گر پڑی تھی اور دہشت زدہ سی کبھی پھول کی جانب دیکھ رہی تھی اور کبھی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو۔ اس ہتھیلی پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور ان میں سے خون کی سرخی جھلک رہی تھی۔

کانٹوں نے طمانچے کا جواب دیا تھا اور وہ پھول جوں کا توں ان کانٹوں کی آغوش میں مسکرا رہا تھا۔

○☆○

فرید تھانیدار کے ساتھ شہداد کوٹ گیا تھا۔ پہلی جولائی کو جن سپاہیوں کی ڈیوٹی اسٹیشن پر تھی ان میں سے ایک سپاہی نے شادو کی تصویر پہچان کر کہا کہ اس عورت کو اس نے اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ وہ عورت عثمان گوٹھ کا راستہ پوچھتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے فلاں گدھا گاڑی والے سے کہا تھا کہ اسے عثمان گوٹھ تک پہنچا دے۔ پھر تھانیدار نے گدھا گاڑی والے کو پکڑا۔ وہ قسمیں کھانے لگا کہ اس عورت کو وہ عثمان گوٹھ تک صحیح سلامت پہنچا کر آیا ہے۔ لیکن اس

www.pklibrary.net

کے سچ پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ تھانیدار نے اس پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔

فرید نے کہا۔ "اگر تم نے اسے میرے گھر تک پہنچا دیا تھا تو وہ گھر پر ہی ملتی۔ سچ بتا کہ تم اسے کہاں لے گئے؟"

گاڑی بان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں قسم کھاتا ہوں کہ اسے آپ کے دروازے تک پہنچا کر آیا ہوں۔"

تھانیدار نے پوچھا۔ "کیا تم ان عورتوں کو پہچان لو گے جنھوں نے شادو کو گھر میں بلایا تھا؟"

"عورتیں؟" گاڑی بان نے بوکھلا کر کہا۔ "وہاں میں نے کسی عورت کو نہیں دیکھا۔"

میرا مطلب ہے کہ مکان کا دروازہ بند تھا۔ میرے واپس جانے تک وہ عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر کسی کو آواز نہیں دی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ میرے جانے کے بعد وہ اس مکان میں گئی تھی یا کسی دوسری طرف چلی گئی تھی۔"

"یہ بکواس کرتا ہے، تھانیدار صاحب!" فرید نے کہا۔ "شادو دروازے تک پہنچے اور گھر کے اندر نہ جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ بد معاش ہے جھوٹ بولتا ہے۔ میرے کھیت مزدوروں یا کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا۔ فرض کر لیا جائے کہ میری دوسری بیوی نے شادو کو سوکن سمجھ کر گھر میں گھسنے نہیں دیا تھا تو ایسی صورت میں وہ وقتی طور پر پناہ لینے قریبی بستی میں جاتی اور آس پاس کے کسی زمیندار کے ہاں پناہ لیتی لیکن تمام لوگوں کا یہی بیان ہے کہ انہوں نے شادو کو کہیں نہیں دیکھا۔ یقیناً یہ بد معاش اسے کہیں لے گیا ہے۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ نہ جانے وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔"

تھانیدار نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں یہ بد معاش سیدھی طرح سچ نہیں بولے گا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اسے حوالات میں بند کر دو۔ روز صبح شام ڈنڈے پڑیں گے تو اس کا باپ بھی سچ بولنے پر مجبور ہو جائے گا......."

گاڑی بان چیختا چلاتا، روتا پیٹتا رہا مگر اس پر لاتیں، جوتے اور ڈنڈے برستے رہے۔ جب مار کھا کھا کر اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تو اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ جرم

www.pklibrary.net

کسی نے کیا تھا۔ شامت کسی کی آئی تھی۔

واپسی پر تھانیدار نے فرید سے کہا۔ "یہ گاڑی بان اسی طرح مار کھاتا رہے گا مگر سچ نہیں بولے گا۔ ایسے مجرموں سے اکثر ہمارا سابقہ پڑتا ہے جو عورتوں کو اغوا کرتے ہیں۔ انہیں بیچتے ہیں یا قتل کر دیتے ہیں۔ گرفتار ہونے پر اپنے جرم کا اقرار نہیں کرتے کیوں کہ انہیں پھانسی یا عمر قید کی سزا کا خطرہ ہوتا ہے۔ انکار کرتے رہنے سے زیادہ سے زیادہ دو چار روز تک مار کھانی پڑتی ہے۔ اس گاڑی بان کے خلاف بھی کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ اس نے شادو کو کہیں بیچ دیا ہے یا قتل کر دیا ہے۔ قانون ہر پہلو کو ٹٹولتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے شادو کو گھر کے دروازے تک پہنچا دیا ہو۔ تمہاری دوسری بیوی نے اسے گھر میں آنے کی اجازت نہ دی ہو یا شادو نے ہی سوکن کے ساتھ رہنا گوارا نہ کیا ہو۔ وہ پناہ کی تلاش میں کسی دوسری جگہ چلی گئی ہو اور کسی اور کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ سوچنے اور عمل کرنے کے ہزار راستے ہیں۔"

تھانیدار اس کے ساتھ گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اس نے کندن اور اس کی ماں کو بلا کر مختلف سوالات کئے۔ دونوں ماں بیٹی سمجھتی تھیں کہ ایسی تحقیقات سے بھی گزرنا ہو گا۔ انہوں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے مگر اقرار نہیں کریں گی کہ شادو یہاں آئی تھی۔

تھانیدار مایوس ہو کر چلا گیا۔

گاڑی بان پر کھلا مقدمہ چلایا جا سکتا تھا مگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شادو کو اس نے گم کیا ہے یا شادو خود کہیں چلی گئی ہے۔

کندن پر بھی شبہ نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ شادو کو کسی نے عثمان گوٹھ میں نہیں دیکھا ہے گھر کی گونگی دیواریں اس خونی واقعے کی گواہی نہیں دے سکتیں تھیں۔ آنگن میں کھلنے والے سرخ گلاب رہ رہ کر فرید کی توجہ کو پکارتے تھے۔ فرید انہیں دیکھتا تھا، چھوتا تھا، سونگھتا تھا مگر سمجھ نہیں سکتا تھا۔ بس دل تھا کہ ادھر کھنچا چلا جاتا تھا۔ صبح و شام جب اسے فرصت ملتی تو وہ کنویں کے چبوترے پر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ ایک عجیب حسرت بھری نگاہوں سے ان پھولوں کو دیکھتا اور زیر لب بڑبڑاتا رہتا۔ ایک نیم دیوانگی سی کیفیت اس پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ کیا بڑبڑاتا تھا؟ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کندن ادھر سے

www.pklibrary.net

گزرتی تو وہ یہی سمجھتی کہ وہ شادو سے باتیں کر رہا ہے۔
کیا وہ سمجھ رہا ہے کہ شادو وہاں چھپی ہوئی ہے؟
یا وہ لہو کے پھول چغلی کھا رہے ہیں۔ "میں یہاں ہوں۔ میں یہاں ہوں۔"
وہ مرنے والی ہر وقت اس مجرمہ کا دل دہلاتی رہتی تھی۔
پھر ایک رات وہ فرید سے بولی۔ "تم کب تک مجھ سے دور رہو گے.....؟"
"میں بہت پریشان ہوں کندن۔"
"تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو فرید۔ میں تمہاری پریشانیاں دور کر دوں گی۔ میں تمہیں اتنا پیار دوں گی، اتنا پیار دوں گی کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔"
فرید نے گہری سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ بھی پیار اور توجہ کی مستحق تھی۔ وہ بھی اس کی بیوی ہی تھی۔ ایسی بیوی جو ایک گناہ کی سزا بھگتنے کے لئے ملی تھی۔ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو عام حالات میں ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔ صرف گناہ کے وقت برداشت کر لی جاتی ہیں۔ مگر اب فرید کے سامنے گناہ نہیں تھا ایک خاوند کا فرض تھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔
"اچھی بات ہے بتی بجھا دو۔"
"کیوں؟" وہ اٹھلا کر بولی۔ "ہم کوئی گناہ تو نہیں کر رہے ہیں۔"
"جو کہتا ہوں وہ کرو۔ ورنہ میں سو جاؤں گا۔"
وہ چپ چاپ اٹھی اور لالٹین بجھا دی۔
کمرے میں تاریکی پھیل گئی اس تاریکی میں فرید نے کندن کو گم کر دیا اور آنکھیں بند کر کے شادو کا سراپا تلاش کرنے لگا...... اور وہ آ گئی۔ اس کے برابر لیٹ گئی۔
وہ کون ہے؟ وہ آنے والی کون ہے؟
اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لیا۔ تمام نازک بدن تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ صرف ادائیں اور انداز مختلف ہوتے ہیں۔ اندھیرے میں جس پیکر جاں کا تصور کرو۔ وہی سامنے آ جاتا ہے اور وہ سامنے تھی اس کے ہاتھ سنہری زلفوں سے کھیل رہے تھے پھر اس کی انگلیاں رخساروں پر آئیں تو رخسار شہابی تھے۔ اس کے ہونٹ سرخ گلاب کی پتیوں کی طرح ملائم تھے اور جذبوں کی حدت سے لرز رہے تھے۔

www.pklibrary.net

تاریکی جگمگا رہی تھی۔ سب کچھ نظر آرہا تھا۔ ریشمی پنکھڑیوں کا پیراہن کھل رہا تھا۔ ذہنوں پر نشیلی دھند چھائی جا رہی تھی۔ ایک اپنے راستے پر بہکا کر لانا چاہتی تھی۔ دوسرا اپنے راستے پر بھٹکتا جارہا تھا۔ بعض اوقات منزل ایک ہوتی ہے مگر راستے الگ الگ ہوتے ہیں۔ دو بدن ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے ہوئے ذہنی طور پر دور رہتے ہیں۔ کچھ اسی انداز میں وہ بھٹک رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت فرید جذبات سے مغلوب ہو کر بڑبڑانے لگا۔

"شادو۔ میری شادو۔ میں اب تم سے دور نہیں......"

یک بیک کندن تڑپ کر اس سے الگ ہوگئی اور چیخ کر بولی۔

"کون شادو؟ کہاں کی شادو؟ مرگئی تمہاری شادو، تم شادو سمجھ کر میرے قریب آئے ہو۔ میں کتیا بننا پسند کروں گی مگر شادو بن کر تمہارے پاس نہیں آؤں گی......"

وہ روتی ہوئی اپنی منجھی پر آکر گر پڑی۔

فرید اندھیرے میں اپنا سر تھامے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ "میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں بہت پریشان ہوں مجھے تم سے نفرت نہیں ہے کندن مگر ابھی میں تمہیں محبت نہیں دے سکتا۔ وہ بری طرح میرے حواس پر چھائی ہوئی ہے۔ شاید میں اسے کبھی نہ بھلا سکوں۔ جب میں ان گلابوں کو دیکھتا ہوں تو وہ آپ ہی آپ میری نگاہوں میں روشن ہوجاتی ہے۔